وارث شاہ اور معاشرتی زوال

Waris Shah and Social Downfall of the Punjab

ڈاکٹر منیر گجر*
محمد ابرار ظہور**

Abstract

When it comes to elucidate the true picture of contemporaneous society, Waris Shah perhaps is the most illustrious poet of Punjab. He depicted the actual picture of those institutes on which a society stands firm. In doing so, his methodology is very diverse altogether. At first he shows you a very pleasing picture of a very celebrated institution e.g. judiciary, religion and joint family system etc. and then starts to divulge the real picture where the journey towards decay has taken start. He does all this in masquerade of satire. Being satirical is not easy. It demands a profound mind enriched with folk wisdom and deeply rooted in local tradition. This article takes an account of Waris Shah's unique technique of setting stage and arranging a dialogue; a dialogue that always has a symbolic significance in revealing the underlying reality.

تلخیص

اٹھارویں صدی میں دنیا بھر میں بادشاہت کا نظام زوال پذیر ہو چکا تھا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغل حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔ اس لیے ملک انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہو گیا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے پر پنجاب بھی شورشوں اور

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں،یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔
** اسسٹنٹ پروفیسر/انچارج شعبہ تاریخ،یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

بغاوتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ان تمام حالات کا سلسلہ وار تاریخی جائزہ ایک شاعر کو جانچنے کے لیے ضروری ہے۔ اورنگزیب کے بعد تخت نشینی کی مسلسل جنگوں اور بادشاہوں کے لگاتار اتار چڑھاؤ کے بعد محمد شاہ رنگیلا کا عہد حکومت نسبتاً طویل ہے اور یہی وارث شاہ کا زمانہ بھی ہے۔ محمد شاہ ۱۷۴۸ء تک (اپنی وفات تک) تخت نشین رہا۔ اس کے دور میں مرہٹوں، سکھوں اور افغانوں نے تباہی مچا رکھی تھی۔ نادر شاہ کے حملوں کی وجہ سے مغلیہ سلطنت بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ ملک بھر میں صوبیداروں اور جاگیرداروں نے اپنی اپنی خود مختاری اختیار کی ہوئی تھی۔ آپس میں مختلف گروہ لڑ بھڑ جاتے۔

جج بڑی بے حیائی سے فیصلے بیچتے تھے اور دیہاتوں پر ظلم و ستم اور محصولات کی زیادتی تھی۔ وارث شاہ (۱۷۲۲ء-۱۷۹۸ء) لکھتے ہیں کہ کس طرح رانجھے کے بھائیوں نے قاضی کو رشوت دے کر بنجر اور بیکار زمین رانجھے کو دلوائی۔ یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ مغل دربار کے تجربہ کار اور اہل امراء کنارہ کش ہو چکے تھے۔ سرکاری خزانہ خالی تھا۔ جاگیر اور منصب مراثیوں اور ڈوموں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ افواج کمزور تھی۔ سپاہیوں کے لیے تنخواہ نہ تھی۔ عوام میں بے چینی اور مایوسی تھی۔ امراء کی تقرریاں اور برطرفیاں روز کا معمول تھا۔ امور سلطنت ذاتی اغراض کو مد نظر رکھ کر طے پاتے۔ وارث شاہ متعدد مقامات پر اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فوجدار تغیر ہو آن بیٹھا۔ فوجدار بحال ہوا آیا ای، چڑھی صاد بحالیاں کھڑیاں نوں برطرفیاں تے مہیں وال کیتو، وغیرہ وغیرہ(الف)

تعارف

معاشروں اور تہذیبوں کا عروج و زوال ایک قدرتی عمل ہے۔ جب بھی کسی معاشرے میں اقدار زوال پذیر ہوتی ہیں تو دانش مند لوگ اور بالخصوص شعراء اور ادباء اس سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس زوال کا باعث ہوتے ہیں جب کہ کم عقل لوگ روایت پسندی اور خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں اور سچ کا ادراک

کیے بغیر عظمتِ رفتہ کے گُن گاتے رہتے ہیں۔اس کیفیت کو تہذیبی نرگسیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ وارث شاہ نے جو زمانہ دیکھا وہ سیاسی اور سماجی حوالے سے پنجاب کا بد ترین زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ہر طرف لوٹ مار اور پانی کی طرح بہتا خون اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ معاشرہ زوال کی طرف گامزن ہے۔وارث شاہ کے عہد میں محلاتی سازشیں عروج پر تھیں۔ مضبوط مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ وارث شاہ نے یہ سب دیکھا اور ہم عصر حالات کو اپنی لکھت کا حصہ بنایا۔ وارث شاہ نے رمزیہ انداز اپنا کر پنجاب کی معاصر تاریخ رقم کر ڈالی۔ اس کے بیان کا کمال یہ ہے کہ کہیں بھی تاریخ نگاری کا انداز نظر نہیں آتا بلکہ واقعات اور کرداروں کی بات چیت میں ہی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے تاریخ بیان کی گئی ہے۔

کوئی بھی ادیب، شاعر یا فنکار اپنے عہد کا اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا، بلکہ اس پر تو سماج کا قرض ہوتا ہے کہ وہ عصری حالات کے بارے میں لکھے اور حقائق کو تاریخ کا حصہ بنا دے۔ ایک خالص شاعر اور فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنے مشاہدات کو بنا کسی لگی لپٹی اور ذاتی پسند نا پسند یا تعصب کے بغیر پیش کر دے۔ اسی لیے ادب کو معاشرے کا آئینہ بھی کہا جاتا ہے۔ ادب میں کوئی چور دروازہ نہیں ہوتا۔وقت اور حالات خود ہی فن پارے کے معیار کا تعین کر دیتے ہیں۔وارث شاہ نے ایک خالص کلاکار کی طرح ان خرابیوں کی نشاندہی کی۔ اس نے دکھایا کہ وہ ادارے کرپٹ ہو چکے ہیں جو کسی بھی معاشرے کے ستون ہوتے ہیں۔ وارث شاہ نے ان خرابیوں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان پر بھرپور طنز بھی رقم کیا۔ طنز کرنا عام ذہن کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت ہی گہرا اور معاشرتی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور دھرتی سے جڑا ہوا ذہن درکار ہوتا ہے۔ خرابیوں اور کوتاہیوں کومحسوس تو ہر کوئی کر لیتا ہے لیکن ادیب اور شاعر کو تو اسے آگے بیان بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس بیان میں اس کے اندر کی کڑواہٹ نظر آتی ہے جو برے معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کڑواہٹ کو طنزیا مزاح کے پردے میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔

ہر مذہب اور معاشرے میں زندگی گزارنے کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک نظریاتی

(Ideal)اور دوسری عملی(Existing)۔ بگاڑ تب پیدا ہوتا ہے جب ہم باہمی گفتگو میں تو نظریاتی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے ساری بحث کرتے ہیں لیکن زندگی عملی سطح پر گزار رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جھوٹ بولنا کسی بھی مذہب یا معاشرے میں روا نہیں ہے لیکن عملاً آج کون سا معاشر ہ اس سے خالی ہے؟اچھا یا برا کی بحث کو ایک طرف رکھ کر دیکھیں تو ہماری زندگیوں میں اس کی موجودگی تو ہے۔ یعنی نظریاتی سطح پر اسے برا جانتے اور مانتے ہوئے بھی ہم اس کے حصار سے باہر نہیں ہیں۔ وارث شاہ نے یہی کمال کیا ہے کہ معاشرے کے زوال کی بیان کاری کے لیے پہلے نظریاتی تصاویر دکھائی ہیں جو کہ بہت خوبصورت اور مثالی ہیں‌اور پھر ان کے اندر کی یعنی عملی صورتحال کو بیان کر کے سچ آشکار کیا ہے ۔یوں اس نے تقابل کی فضا ء پیدا کر کے قاری کے سامنے دونوں صورتیں رکھ دی ہیں۔ وارث شاہ نے یہ سب طنز کے پردے میں کیا ہے۔ طنز کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی کیونکہ طنز اور گنوارپن میں بہت ہی باریک سی لکیر ہوتی ہے۔ گنوار پن میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے جبکہ طنز کے لیے زمین سے تعلق رکھنے والااور رِیت میں پیوست ذہن درکار ہوتا ہے۔ وارث شاہ قصے کا آغاز رانجھے کے گاؤں تخت ہزارہ سے کرتا ہے۔ حمد،نعت اور منقبت وغیرہ کے بعد قصے کے باقاعدہ آغاز کی شروعات ہی تخت ہزارہ کو بہشت قرار دینے سے ہوتی ہے۔ تخت ہزارے کی تعریف ذرا

وارث شاہ کی زبانی ہی سُنیے:

اک تخت ہزاریوں گل کیجے، جتھے رانجھیاں رنگ مچایا اے
چھیل گبھرو مست اربیلڑے نیں، سندر اک تھیں اک سوایا اے
والے ، کوکلے ، مُندرے ، مجھ لُنگی، نواں ٹھاٹھ تے ٹھاٹھ چڑھایا اے
کیہی صفت ہزارے دی آکھ سکاں ، گویا بہشت زمین تے آیا اے (۱)

اس تصویر کے ذریعے وارث شاہ ایک ایسے معاشرے کی جھلک دکھاتا ہے جو پہلی نظر میں بہت خوشحال، پرسکون اور آسودہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں حسن، پیار اور خلوص کی بہتات

ہے۔ نوجوان موج مستی میں جھومتے ہوئے ایک سے بڑھ کر ایک وجیہہ و شکیل ہیں۔نوجوانوں کی ظاہری حالت ان کی مالی آسودگی کا پتہ دیتی ہے۔ وارث شاہ جیسا قادر الکلام شاعر بھی جب کہتا ہے 'کیہی صفت ہزارے دی آکھ سکاں' تو گویا وہ اپنی بے بسی کا اقرار کر رہا ہے کہ یہ خطۂِ زمیں اس قدر خوشحال ہے کہ 'گویا بہشت زمین تے آیا اے'۔اب بہشت یا جنت کا تصور کیا ہے؟ آسان لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں رذائل کی گنجائش نہیں ہوگی بلکہ صرف خلوص ، پیار اور قربانی کے جذبات سے مملو زندگی ہوگی۔قاری ابھی چشمِ تصور میں اس معاشرے کی خوشحالی اور آسودگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے کہ وارث شاہ اس کی اصلیت سامنے لے آتا ہے ۔ رانجھا بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ایک تو سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور دوسرا ماں کے بچپن میں انتقال کی وجہ سے وہ باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔ بھائیوں کو باپ کی اس سے رغبت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ باپ کے جیتے جی وہ اسے کچھ کہہ تو نہیں سکتے تھے البتہ ان کے اندر کی کھینچا تانی کی تصویر کشی کے ذریعے وارث شاہ پہلی اور خوشحال تصویر کی پرتیں اتارنا شروع کرتا ہے:

باپ کرے پیار تے وَیر بھائی، ڈر باپ دے تھوں پے سنگدے نیں
گھجے مہنے مار کے سپ وانگوں ، اوس دے کالجے نوں پۓ ڈنگدے نیں
کوئی وس نہ چلنے کڈھ چھڈن، دیندے مہنے رنگ برنگ دے نیں
وارث شاہ ایہہ غرض ہے بہت پیاری، ہور ساک نہ سَین نہ انگ دے نیں(۲)

باپ کی سانسیں پوری ہوتی ہیں تو بھائیوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے اور اندر ہی اندر پکتا لاوہ پھٹ نکلتا ہے ۔ 'گھجے مہنے' براہِ راست لڑائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور جنگ کی سی کیفیت برپا ہو جاتی ہے ۔ بھائی کوسنے اور طعنے دینے سے آگے بڑھتے ہیں اور پشتینی زمین کا بٹوارہ ہو جاتا ہے۔

یہاں اب وارث شاہ وہ بات کہتا ہے جس کے لیے اس نے یہ سٹیج تیار کیا ہے:

حضرت قاضی تے پنچ سدا سارے، بھائیاں زمیں نوں کچھ پوایا اے
وڈھی دے کے بھوئیں دے بنے وارث ، بنجر زمیں رنجھیٹے نوں آیا اے(۳)

وارث شاہ نے معاشرے کے سب سے معتبر ادارے یعنی عدلیہ میں جنم لینے والا بگاڑ دکھایا ہے۔ باپ کے کوچ کرتے ہی بھائی زمین کے بٹوارے کے لیے قاضی اور گاؤں کے دیگر سرکردہ لوگوں کو بلاتے ہیں۔ یہاں قاضی اور سرپنچ رشوت لے کر رانجھے سے زیادتی کرتے ہیں‌اور زمین کی تقسیم میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ رانجھے کا مقسوم بنجر زمین ٹھہرتی ہے۔ وارث شاہ نے نہ صرف اس خرابی کی نشاندہی کی ہے بلکہ رشوت خور قاضی کو 'حضرت قاضی' کہہ کر اس کے سماجی رتبے پر بھی طنز کیا ہے۔ جس معاشرے میں رشوت کے ذریعے انصاف کے ترازو کو مرضی کے مطابق جھکایا جا سکے اس کے زوال کو روکنا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔

آگے چلتے ہیں۔ رانجھا زمین کی غیر منصفانہ تقسیم کو رد کرتا ہے اور بھائیوں سے جھگڑ کرگھر چھوڑ کے نکل جاتا ہے ۔ گاؤں کے لوگ بھائیوں کو شرمندہ کرتے ہیں کہ تمھارا بھائی گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے تو لوگوں کی لعن طعن کے ڈر سے وہ اسے روکنے اور منانے آتے ہیں۔ ان کی اندرونی کیفیت کی تصویر کشی تو وارث شاہ پہلے ہی زمین کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے کر چکا ہے۔ یوں بھائیوں کی جذباتی باتیں بجائے خود ایک طنز بن جاتی ہیں۔ بھائی رانجھے سے کہتے ہیں:

بھائیاں باہجھ نہ مجلساں سوہندیاں نی، اتے بھائیں باہجھ بہار ناہیں
بھائی مرن تاں پوندیاں بھج باہاں، بناں بھائیاں پرہے پروار ناہیں
لکھ اوٹ ہے کول وسیندیاں دی، بھائیاں گیاں جیڈی کوئی ہار ناہیں
بھائی ڈھاوندے بھائی اساردے نیں، بھائیں باہجھ باہاں،بیلی، یار ناہیں (۴)

''بھائیوں کے دلائل بہت جذباتی ہیں‌لیکن رانجھا ان سب کی اصلیت سے واقف ہے۔
وہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ سب کھوکھلے دعوے ہیں۔
بھائی اسے روایتی قسم کی مثالیں دے کر گھر تیاگ کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔
یہ ساری باتیں سن کر رانجھا بھائیوں کو ان کے اندر کا سچ دکھاتا ہے:
وچوں خوشی ہو اساں دے نکلن تے، گل آکھدے مونہوں کیوں سنگدے او' (۵)

اب ساری صورتحال کو سامنے رکھیں تو اس میں مشترکہ خاندانی نظام گرتا ہوا دکھائی دیتا

ہے۔ جس نظام پر مشرق ہمیشہ نازاں رہا، اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ بھائیوں کا اکٹھا ہونا اور خاندان کی رونقیں اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہیں۔بھائی اس نظام کے محافظ بنے ہوئے ہیں حالانکہ دراصل وہی اس کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔زمین کے بٹوارے کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے کا وقت آیا چاہتا ہے۔وہ صرف رسم و رواج کو نبھانے کے لیے اور معاشرے میں شرمندگی سے بچنے کے لیے رانجھے کو روک رہے ہیں۔ رانجھا قصے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کی گفتگو میں شاعر نے زندگی کے بارے میںاپنا نظریہ دینا ہے۔ رانجھے کو کوچ کروا کے شاید وارث شاہ یہ بتانا چاہ رہا ہے کہ کھوکھلی شان وشوکت کو تیاگ کر نیا معاشرہ اور نئی اقدار تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔

رانجھا گھر سے نکلتا ہے تو پہلی رات کا پڑاؤ ایک مسجد میں کرتاہے۔ یہاں رانجھے کی آنکھ سے وارث شاہ جو دیکھتا ہے،ایک سچا فنکار اسے بیان کیے بغیرنہیں رہ سکتا اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہب کےکسی بھی پہلو پہ بات کرنا ایک انتہائی حسّاس مسئلہ ہوتا ہے۔ اس بات کا ادراک وارث شاہ سے بڑھ کر کسے ہو سکتا تھا، جو خود امام مسجد تھا۔یہاں پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں پہلے مسجد اور مولوی کی بہت قابلِ احترام تصویر دکھاتا ہے اور قاری کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ مسجد اور مذہبی شعائر سے مکمل طور پر آگا ہ ہے۔ مسجد میں بچوں کے تعلیم حاصل کرنے اور امام مسجد کی دین کے معاملے میں محنت کا ذکر کرنے کے بعدوہ اصل بات کی طرف آجاتا ہے۔سب سے پہلے وہ مسجد کی تعریف یوں کرتا ہے:

مسجد بیت العتیق مثال آہی، خانے کعبیوں ڈول اتاریا نیں
گویا اقصیٰ دے نال دی بھین دوئی، صندلی نور اساریا نیں (۶)

اس کے بعد مسجد میں بطور نصاب پڑھائی جانے والی کتب کا ذکر آتا ہے تووارث شاہ عربی ، فارسی کی لگ بھگ ۲۳ کتب کی گنتی کرتا ہے جن میں عالمی کلاسیک کا درجہ رکھنے والی کتب گلستان، بوستان، بہارِ دانش، دیوانِ حافظ، قران ا لسعدین، شیریں و خسرواورطوطی نامہ شامل ہیں۔ مولوی کی تعلیم کے معاملے میں طلباء پر سختی کا ذکر یوں کرتا ہے:

اک بھُل کے عین دا غین دا واچن، مُلّاں جند کڈھے نال کڑکیاں دے (۷)

یوں وارث شاہ نے ہر اس سوال کا جواب پہلے ہی دے دیا جو اس کے اعتراضات کے جواب میں روایتی طور پر اٹھائے جا سکتے تھے۔ یہاں اس کے فن کا معترف ہونا پڑتا ہے ۔ اسے بخوبی علم تھا کہ مذہب جیسے نازک موضوع پر بات کس ڈھنگ سے کرنی ہے۔ کیوں کہ اس معاملے میں ذرا سی بے احتیاطی سے کُفر کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے اس نے پہلے مولوی کے احترام اور مسجد کی عظمت کی دھاک بٹھائی۔ اب ایک طرف تو مولوی کی اتنی بلند شان اور دوسری طرف وارث شاہ قصے میں مولوی کی انٹری کیسے کرواتا ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیں:

بھُکھ ننگ نوں جھاگ کے پندھ کرکے، راتیں وچ مسیت دے آیا ئے
ہتھ ونجھلی پکڑ کے رات ادھی، رانجھے مزا بھی خوب بنایائے
رن مرد نہ پنڈ وچ رہیا کوئی، سبھا گرد مسیت سدایائے
وارث شاہ میاں پنڈ جھگڑیاں دی، پچھوں مُلّاں مسیت دا آیائے (۸)

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں وارث شاہ صرف مولوی پر طنز کے تیر برساتا ہے۔سارا گاؤں بانسری سُن کر مسجد میں براجمان ہے، انھیں وارث شاہ کچھ نہیں کہتا۔ مذہب کی حفاظت کا ذمہ مولویوں نے ازخود ہی لیا ہوا ہے۔مسجد میں لوگوں کو کسی بھی طرح سے خوشی ملے اور ساتھ میں مُلّا کا سرٹیفکیٹ نہ ہوتو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟رانجھے کے مکالموں کے ذریعے وارث شاہ صرف سسٹم پر ہی معترض نہیں ہوتا بلکہ مولوی کے مونہہ سے جواب دلوا کر دوسری طرف کا نقطہ نظر بھی سامنے لاتا ہے۔ رانجھے کی باتیں زیادہ کاٹ دار ہیں۔ وہ چُن چُن کر ایسی باتیں کرتا ہے جن کے ذریعے مولوی معاشرے میں اپنی ساکھ بنائے بیٹھا ہے:

باس حلویاں دی خبر مُردیاں دی، نال دعائیں دے جیوندے ماردے ہو
انھے کوڑھیاں لوہلیاں وانگ بیٹھے، قرعہ مرن جمان دا دھاردے ہو
شرع چا سرپوش بنایا جے، رودار وڈے گنہگار دے ہو

وارث شاہ مسافراں آیاں نوں، چلو چل ہی پۓ پکاردے ہو (۹)

اس بحث میں رانجھا کچھ ایسی باتیں بھی کرتا ہے جن کو بظاہر تو طنز کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے لیکن ان کے پیچھے بھی ایک گہری رمز ہے:

سانوں دس نماز ہے کاس دی جی، کاس نال بنا کے ساریا نیں
کن نک نماز دے ہین کتنے، متھے کیہناں دے دُھروں ایہہ ماریا نیں
لمبے قد چوڑی کس ہان ہوندی ، کس چیز دے نال سواریا نیں
وارث کِلیاں کتنیاں اس دیاں نیں، کس نال ایہہ بنھ اتاریا نیں (۱۰)

رانجھا ایک بھولا بھالا جاٹ بن کر یہ سوال کررہا ہے لیکن اصل میں یہاں وارث شاہ مولوی کو چھیڑ رہا ہے کہ مولوی کو اپنی جن عبادات پر فخر ہے وہ صرف دکھاوا ہی رہ گئی ہیں، روح سے خالی۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مولوی نے تو مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ رانجھے اور مولوی کی بحث میں وارث شاہ نے آخر میں مولوی کو ہتھیار پھینکتے دکھایا ہے۔ اس بحث میں مولوی ہار گیاہے اور خدا معلوم اندر سے قائل بھی ہو گیا ہو لیکن یہاں بھرے پنڈال میں ہار ماننا صرف اس کے لیے ہی نہیں بلکہ ساری مُلّا منڈلی کے لیے کاروباری حوالے سے گھاٹے کا سودا ہے۔ وہ کمال چالاکی سے ہار مانے بغیر رانجھے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور یوں اپنا بھرم قائم رکھنے کا جتن کرتا ہے۔وہ دلائل سے تو رانجھے کو چپ نہ کروا سکا لیکن موقع بچانے کے لیے اسے مسجد میں رات بھر قیام کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ وہ رانجھے کے قیام کے لیے ایک شرط بھی رکھتا ہے:

مُلّاں آکھیا نامعقول جٹّا، فرض کج کے رات گزار جائیں
فجر ہوندی تھوں اگے ہی اٹھ ایتھوں، سرکج کے مسجدوں نکل جائیں (۱۱)

اس شرط میں مولو ی کا کھوکھلا پن نظر آرہا ہے۔ جس علم کا پاکھنڈ وہ بنائے بیٹھا ہے، وہ تو اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ اس کے پاس صرف علم کے بلند و بانگ دعوے ہیں۔ ان دعووں کے پیچھے ہی وہ اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ 'فجر ہوندی تھوں اگے ہی' رانجھے کو کوچ کرنے کا حکم دے کر وہ اپنا کل محفوظ کررہا ہے۔ وہ قطعاً برداشت

نہیں کر سکتا کہ رانجھا زیادہ دیر وہاں رکے اور لوگوں کو مولوی کے کردار اور نازک مذہبی مسائل پر سوچنے اور سوال کرنے پر مائل کرے۔ جیون سنگھ دیول اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "Throughout the poem, Ranjha acts as a figure who reveals the flaws of key figures such as the mulla, and many of the poem's most biting and memorable critiques of formal religion come from his speeches."(12)

جھنگ پہنچ کر رانجھا ہیر سے ملتا ہے۔ دونوں پہلی نظر میں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے وعید ہوتے ہیں۔ ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کو باہم میسر رہنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ طے یہ پاتا ہے کہ رانجھا ہیر کے باپ کے ہاں نوکری کر لے۔ ہیر اسے اپنے باپ کے ہاں ملازم رکھوانے لے جاتی ہے۔ یہاں وارث شاہ پہلے ہمیں ہیر کے مونہہ سے اس کے باپ چوچک کے جاہ و جلا ل کا پتہ دیتا ہے:

ہیر جائیکے آکھدی بابلا وے، تیرے ناؤں توں گھول گھمائیاں میں
جس اپنے حکم تے راج اندر، وچ سندل بار کھڈائیاں میں
لاساں پٹ دیاں پائیکے باغ کالے، پینگھاں شوق دے نال پنگھائیاں میں
میری جان بابل جیویں ڈھول راجا، ماہی مہیں دا ڈھونڈ لیائیاں میں(۱۳)

ساندل بار میں چوچک کا راج ہے اور ہیر اس کی لاڈلی بیٹی ہے۔ چوچک کے سماجی رتبے کو سمجھنے کے لیے ذرا پیچھے نظر ڈالیں تو قصہ ہیر کے بانی شاعر دمودر کے ہاں بھی اس کی شان و شوکت کا ذکر کچھ یوں ملتا ہے:

اکبر نال کریندا دعوے، بھوئیں نئیں دا سائیں (۱۴)

رانجھے کو نوکر رکھ لیا جاتا ہے اور ہیر کا رانجھے سے میل ملاقات کا سلسہ شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ تو بات چھپی رہتی ہے لیکن کتنی دیر؟ آہستہ آہستہ اس عشق کے چرچے زبانِ زدِ عام ہو جاتے ہیں ۔بات بہت بڑھتی ہے تو برادری والے ہیر کے ماں اور باپ

کو مطعون کرتے ہیں۔ بالآخر طعن و تشنیع سے تنگ آ کر چوچک رانجھے کو ان الفاظ میں نوکری سے جواب دیتا ہے:

راتیں رانجھے نے مہیں جا آن ڈھوئیاں، چوچک سیال متھے وٹ پایا ئی
بھائی چھڈ مہیں اُٹھ جا گھر نوں، تیرا طور بُرا نظر آیا ئی
سیالو کہو بھائی ساڈے کم ناہیں، جائے اودھرے جدھروں آیائی
اساں سانھ نہ رکھیا نڈھیاں دا، دھیاں چارنیاں نہیں بنایائی(۱۵)

اس بند میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی 'سیالو کہا بھائی' اور دوسری 'اساں سانھ نہ رکھیا نڈھیاں دا'۔ ان سے معلوم پڑتا ہے کہ چوچک کے ساتھ ساتھ باقی سیال بھی ہیر اور رانجھے کے تعلقات سے باخبر تھے۔اس بات کو ذہن میں رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ رانجھا نوکری سے نکالے جانے کے بعد گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔بھینیس اس کے ساتھ اس قدر مانوس ہو چکی تھیں کہ کسی اور نوکر کے قابو میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ ہیر کی ماں اور باپ آپس میں مشورہ کرتے ہیں ۔رانجھے کے جانے کی صورت میں مالی نقصان زیرِ غور آتا ہے۔ اب چوچک کی جاگیردارانہ حیثیت کو ذہن میں رکھیں اوروارث شاہ نے چوچک کے مونہہ سے جو الفاظ بلوائے ہیںوہ ذرا ملاحظہ فرمائیں:

چوچک آکھیا جا منا اوس نوں، ویاہ تیک تاں مہیں چرا لیئے
جدوں ہیر ڈولی پا تور دیئے، رُس پوے جواب تاں چا دیئے
ساڈی دھی دا کجھ نہ لاہ لیندا، سبھا ٹہل ٹکور کرا لیئے
واث شاہ اسیں جٹ سدا کھوٹے، جڑکا فند ایتھے ہک لا لیئے(۱۶)

یہ زوال پذیر جاگیر داری نظام کا بہت اہم پہلو ہے جو وارث شاہ سامنے لے کر آیا ہے۔ چوچک کا اوپر بیان ہوا جاہ جلال ذرا یاد کریں اور پھر 'ساڈی دھی دا کجھ نہ لاہ لیندا' پر غور کریں۔صرف ایک مصرعے سے ہی پچھلی ساری شان و شوکت جھوٹھ کی گٹھڑی بن گئی ہے۔ وارث شاہ نے رؤساء کے اندر کے لوبھ لالچ کو کھوج لیاہے۔یعنی اتنا بڑا رئیس مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار نہیں، چاہے بیٹی کی عزت داؤ پر لگی رہے۔کاہے کی سرداری

اور کیسا راج؟ مالی منفعت ہی سب کچھ ہے۔ یہی بات وارث شاہ نے قصے کے آغاز میں بھائیوں کی لڑائی میں بھی کہی تھی:

وارث شاہ ایہہ غرض ہے بہت پیاری، ہور ساک نہ سَین نہ انگ دے نیں (۱۷)

چوچک کی اس بات سے تخت ہزارہ اور جھنگ کے مابین ایک سانجھ دکھائی دیتی ہے۔ دونوں جگہ اصل چیز قبضہ ہے۔ رانجھے کے بھائی اور چوچک ایک جیسی سوچ کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک انسانی جذبات سے کہیں زیادہ اہمیت زمین جائیدادکی ہے۔ چوچک کا سب کچھ جانتے ہوئے ایک ایسے شخص کو گھر میں دوبارہ داخل ہونے دیناجس کے تعلقات اس کی بیٹی کے ساتھ ہیں، اس کے سماجی رُتبے کے بالکل منافی ہے۔ لیکن وہ ایسا کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ کہ اسے اپنی چالاکی سمجھتا ہے۔ وہ تو اپنی دانست میں ’جٹکا پھند‘ لگا رہا ہے۔

زوال کی ایک اور شکل ہمیں تب دکھائی دیتی ہے جب رانجھا جوگی بننے کے لیے ٹِلہ جوگیاں میں بالناتھ جوگی کے پاس جاتا ہے۔پنجاب میں جوگ ریت صدیوں پرانی ہے۔ دسویں سے پندرھویں صدی عیسوی پنجاب میں پنتھی جوگیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ پنجاب کے لوگ کسی بھی مذہبی وابستگی سے قطع نظر ان جوگیوں کا احترام شروع سے ہی کرتے آئے ہیں۔ وارث شاہ کے عہد میں جوگی فکر بھی زوال کا شکار دکھائی دیتی ہے۔اس زوال کی پہچان بھی وارث شاہ بالکل اسی طرح کرواتا ہے جیسے اس نے مسجد اور مولوی کی پہچان کروائی تھی۔ بالناتھ جوگ کی راہ میں حائل مشکلات بتا کر رانجھے کو جوگ سے منع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ان مشکلات کی گنتی ایک ، دو تک محدود نہیں بلکہ یہ اتنی ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کو جہاں یہ خیال راسخ ہونے لگتا ہے کہ یہ کام تو رانجھے کے کرنے کا نہیں ہے، وہیں جوگ پنتھ کی دھاک بھی اس کے دل پر بیٹھنا شروع ہو جاتی ہے۔ان مشکلا ت میں سے ایک تو سیدھی سادھی رانجھے کے مقصد کی نفی ہے:

اُدیان باشی جتی ستی جوگی، جھات استری تے نہیں پاونا وو (۱۸)

جوگی اسے عورت کی طرف ایک نظر دیکھنے سے بھی منع کر رہا ہے لیکن دلچسپ بات

ہے کہ رانجھے کے جوگ لینے کا مقصد ہی عورت ہے۔رانجھے اور بالناتھ میں لمبی بحث ہوتی ہے۔ بالناتھ اسے جوگ پنتھ کی مشکلات اور اقدار کے بارے میں بہت فلسفیانہ انداز میں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن رانجھا تو سب کشتیاں جلا کر نکلا تھا سو کسی صورت مان کے ہی نہ دیا۔تھک ہار کر بالناتھ اسے جوگ دان کر دیتا ہے۔جوگ دینے کے بعدجب بالناتھ اسے رسمی طور پر نصیحتیں کرتا ہے تو دوبارہ عورت ذات سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے:

وڈی ماؤں برابر جاننی ہے ، اتے بھین برابر چھوٹڑی نوں
جتی ستی نمانیاں ہو رہیے، رکھی ثابت ایس لنگوٹڑی نوں(۱۹)

رانجھا، جو کہ جوگ لے چکا تھا، جوگی کو ٹکا سا جواب دیتا ہے:

ثابت ہوئے لنگوٹڑی سنی ناتھا، کاہے جھگڑا چا اجاڑدا میں
چپ عشق توں رہے جے جیبھ میری، کاہے ایڈڑے پاڑنے پاڑدا میں
جے میں جاندا ہسنوں منع کرسیں، تیرے ٹلے تے دھار نہ ماردا میں
اکے کن سوار دے پھیر میرے، نہیں گھتوں ڈھلیت سرکار دا میں(۲۰)

یہاں پھر رانجھے اور بالناتھ میں بحث ہوتی ہے۔رانجھے کی مبنی بر عشق دلیلوں کے آگے جوگ کا فلسفہ ہار جاتا ہے اور بالناتھ رانجھے کو ان الفاظ میں آشیر باد دیتا ہے:

ناتھ کھول اکھیں کیہا رانجھنے نوں، بچہ جا تیرا کم ہویائی
چڑھ دوڑ کے جِت لے کھیڑیاں نوں، بچہ سون تینوں بھلا ہویا ئی (۲۱)

یہاں سے رانجھا رنگ پور ہیر کے سسرالی گاؤں رنگ پور پہنچتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا سامنا ایک چرواہے سے ہوتا ہے۔یہ ملاقات بھی خاصی دلچسپ رہتی ہے۔ رانجھا چرواہے پر جوگ کے گیان کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن چرواہا اسے بتاتا ہے کہ وہ رانجھے کی اصلیت سے واقف ہے۔آگے ہیر کی نند سہتی اور کھیڑا قبیلے کے سب لوگ اس کی راہ میں مختلف انداز میں حائل ہوتے ہیں جن کی تفصیل یہاں برمحل نہیں ہے۔ رانجھے کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہیر کے شوہر سیدے کی پٹائی کرتا ہے۔

سیدا اچھا خاصا رئیس ہونے کے باوجود مار کھانے کے بعد چپ چاپ گھر پلٹ آتا ہے۔ رانجھا یہ سب جوگ کے پردے میں ہی کرتا ہے۔اب اس بات پر غور کرتے ہیں کہ رانجھا کے جوگ لینے کے بعد وارث شاہ نے جوگ پنتھ کا زوال کیسے دکھایا ہے۔ سب سے پہلے تو بالناتھ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے جوگ دان کرتا ہے، جو کہ جوگ کی روایت کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر تو آپ جوگیوں کے کردار پر نظر ڈالیں کہ جوگی عورتیں بھگاتے پھر رہے ہیں۔رانجھے کے ہیر کو بھگا لے جانے کے پکے ارادے کی بات سن کر بالناتھ اسے 'چڑھ دوڑ کے جِت لے کھیڑیاں نوں' کہہ کر عورت کے بھگانے کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔

جوگ کو فلسفیانہ معنے پتنجلی نے دیے تھے۔ رادھا کرشن پتنجلی کی طرف سے بیان ہوئی جوگ کی شرائط کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "We should practice *ahinsa*, or non violence, truthfulness, honesty, continence and non-acceptance of gifts, i.e. we should abstain from the inflicting of injury, from falsehood, theft, incontinence and avarice. The chief of them all is *ahinsa*, or non-violence, and all other virtues are said to be rooted in it"(22)

یہاں جوگ کے بنیادی اوصاف بیان ہوئے ہیں جو کہ ایک جوگی کے لیے بنیادی اہلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک ایک کرکے ان پر نظر ڈالیں اور پھر رانجھے کے جوگی بننے کے بعد کے زمانے پر غور کریں تو کہیں نا کہیں رانجھا ان سب کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے۔انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ جوگی بننے سے پہلے یہ سارے اوصاف رانجھے کی ذات میں موجود تھے۔یعنی یہاں گنگا اُلٹی ہی بہہ گئی کہ جوگی بننے کے بعد رانجھے نے یہ مثبت اوصاف ترک کیے۔جوگی بننے تک اس کی کسی سے کوئی لڑائی یا مارپیٹ نہیں ہوئی۔جوگی بننے کے بعد وہ جہاں بھی گیا،فساد برپا ہو گیا۔سب سے پہلے تو اس کی چرواہے سے نوک جھونک ہوتی ہے۔ اس سے آگے گاؤں میں داخل ہونے پر ایک مضحکہ خیز صورتحال پیدا ہو جاتی ہے ۔ رانجھا جوگی ایک گھر میں جاتا ہے جہاں ایک جاٹ گائے کا دودھ دوہ رہا ہوتا ہے۔رانجھے کی بھیک مانگنے کی اونچی اور بے سُری آواز سے گائے ڈر کر چھلانگ

لگاتی ہے جس سے دودھ بہہ جاتا ہے ۔ جاٹ غصے میں آکر بھی جوگی کے مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے جوگی کو بھیک دینے کے لیے کہتا ہے۔اس کی بیوی بھیک دیتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ بڑبڑاتی ہے تو جوگی اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے:

جوگی روہ دے نال کھڑلت گھتی، دھول مار کے دند سبھ جھاڑ سٹے
جٹی زمیں تے پڑے وانگ ڈھٹھی، جیہے واہرو پھٹ کے دھاڑ سٹے(۲۳)

قصے میں آگے چل کر جوگی کی مڈبھیڑ ہیر کی نند سہتی سے ہوتی ہے۔دونوں کے درمیان بحث ہوتی ہے ۔ یہ قصے میں سب سے لمبا بیان ہے۔ یہاں وارث شاہ کے بیان کی مہارت اپنے عروج پر ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں خیر اور شر کا ٹاکرا ہوتا ہے لیکن وارث شاہ نے کمال یہ کیا ہے کہ شر کو شر سے ٹکرایا ہے۔ رانجھا اور سہتی دونوں سر تا پا جھوٹ پر کھڑے ہیں۔ رانجھا جوگ کے تقدس کا سہارا لیتا ہے حالانکہ اصلاًوہ جوگی نہیں ہے اور سہتی جو کہ عورت کی پاکیزگی کی علم بردار بن کر مرد اور عورت کے تعلقات کی مخالفت کر رہی ہے ، خودعشق زدہ ہے۔ بہت لمبی بحث کے بعد یہاں بھی بات جوتم پیزار ہونے پر ہی ختم ہوتی ہے۔اس کے بعد رانجھا سیدے کی پٹائی کرتا ہے، عدالت میں جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ جوگی کے روپ میں رانجھے سے یہ سب کروانے کے پیچھے وارث شاہ کی گہری دانشمندانہ سوجھ کارفرما دکھائی دیتی ہے جس نے جوگ پنتھ کی مٹتی ہوئی روایت کومحسوس کر لیا تھا۔ اس نے ہنسی مذاق میں اس کا زوال دکھایا ہے۔ جوگ پنتھ کے زوال کے بارے میں ایک جگہ تو وارث شاہ نے کسی لگی لپٹی کے بغیر بھی لکھا ہے۔ جوگی اور سہتی کی لڑائی میں جب ہیر جوگی کی حمایت میں دلائل دیتی ہے تو سہتی اسے جوگیوں کے کرتوت بتا کر حمایت کرنے سے منع کرتی ہے۔اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوگیوں میں دنیا داری کا لالچ سرایت کر چکا تھا:

بھابی جوگیاں دے وڈے کارنے نی، گلاں نہیں سنیاں کن پاٹیاں دیاں
اوک بنھ پلے دودھ دہی پیون، وڈیاں چاٹیاں جوڑدے آٹیاں دیاں
گُتھ گُتھ ودھائکے وال ناخن، وچ پلم دے لانگراں پاٹیاں دیاں

وارث شاہ ایہہ مست کے پاٹ لتھے، رگاں ٹرلیاں وانگ نیں گاٹیاں دیاں (۲۴)

اس کے بعد رانجھا ہیر کو بھگا لے جاتا ہے۔ یہ وہی رانجھا ہے جو ہیر کی شادی سے پہلے گھر سے بھاگنے کے ہیر کے ارادے کی یہ کہہ کر نفی کرتا ہے کہ:

ہیرے عشق نہ مول سواد دیندا، نال چوریاں اتے ادھالیاں دے (۲۵)

''ہیر وارث شاہ'' کے بارے میں نجم حسین سید نے لکھا ہے:

''وارث دی ''ہیر''اک نقل اے تے ڈھنگ شاعر نے ایس نقل دے آسرے وچ ایہی ورتیا اے پئی بندے دے اک وچار نوں اوہدے دوجے وچار نال، اِک جذبے نوں دوجے جذبے نال، مونہہ دیاں اُچیاں بولاں نوں ڈِ ڈ دیاں دڑ وٹیاں گنجھلاں نال انج بھڑایا جاوے جو اوہدے نال دو آوازاں جمن۔ اک تے ہاسے ٹھٹھے دی اُچی، اُگھڑویں آواز، جیہڑی سُنن وال نوں اک واری پھڑ کے ہلون دیندی اے تے دوجی دُکھ وِنھی سوچ دی آواز جیہڑی ہولی ہولی، پرچھاویں وانگ بندے دے اندر ڈھلدی جاندی اے۔'' (۲۶)

وارث شاہ نے کمال نفاست سے معاشرے کے ان زوال پذیر پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کے بارے میں عمومی طور پر 'سب اچھا' ہی کہا جاتا ہے ۔ اس نے سارے نظام کو گہرائی سے دیکھا، پرکھا اور پھر سب خوبیوں، خامیوں سمیت بیان کر دیا۔

حاصل بحث

'ہیر' کے قصے میں اس معاشرے کی بے شمار تصویریں موجود ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جاگیردارانہ نظام کی اخلاقیات میں اپنے سے کم تر حیثیت رکھنے والے شخص کو بیٹی کا رشتہ دینا بے عزتی کا باعث تھا۔ رانجھے سیالوں کی طرح سردار نہ تھے بلکہ عام زمیندار تھے۔ اسی لیے سیال رانجھے کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ در در کے دھکے کھاتا ہمارے ہاں چاک لگ گیا، ہم اس کو کیسے ہیر کا رشتہ دے سکتے ہیں۔ ہمارے برابر کے تو کھیڑے ہیں۔

رانجھا تمام قصے کے دوران معاشرہ کے مختلف اداروں کا مذاق اڑاتا ہے۔ کیونکہ وہ عام انسان کے لیے نہیں بلکہ ایک مخصوص طبقہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ مثلاً مسجد کا ملا مذہب کو صرف اپنے مطلب کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ اور ملاح جو دریا کے پتن پر قابض

ہے لوگوں کو دریا پار کرانا اپنا مقصد نہیں سمجھتا بلکہ اپنی جیب بھرنا جانتا ہے۔ رانجھے کی راہ میں آنے والے تمام کردار معاشرہ کے کسی نہ کسی شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان سب اداروں کا مقصد ایک خاص طبقے کے مفاد میں کام کرتے رہنا ہے۔

حوالہ جات

الف۔ عذرا وقار، *وارث شاہ: عہد اور شاعری*، اسلام آباد، این آئی ایچ سی آر، قائداعظم یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء، ص۶۔

۱۔ وارث شاہ، ہیر سید وارث شاہ(لاہور:پنجابی ادبی اکیڈمی، 1960ء)، مرتبہ: شیخ عبدالعزیز،ص۸۔

۲۔ ایضاً، ص۱۰

۳۔ ایضاً، ص۱۲

۴۔ ایضاً، ص۲۸

۵۔ ایضاً، ص۲۹

۶۔ ایضاً، ص۳۳

۷۔ ایضاً، ص۳۵

۸۔ ایضاً، ص۳۲

۹۔ ایضاً، ص۴۱

۱۰۔ ایضاً، ص۳۹

۱۱۔ ایضاً، ص۴۲

12. Jeevan Deol, "Sex, Social Critique and the Female figure in Premodern Punjabi Poetry, Varis Shah's Hir", Modern Asian Studies, 2002, 36.1:169

۱۳۔ وارث شاہ، ص۴۷

۱۴۔ دمودر، ہیر دمودر،(لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986ء)، مرتبہ: محمد آصف خاں، ص۳۷۔

۱۵۔ وارث شاہ، ص ۱۰۱

۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۷۔ ایضاً، ص۱۰

۱۸۔ ایضاً، ص۲۹۴

۱۹۔ ایضاً، ص۳۰۹

۲۰۔ ایضاً، ص۳۱۰

۲۱۔ ایضاً، ص۳۲۰

22. Radhakrishnan, Indian Philosophy(London:George Allen & Unwin, 1966) P353

۲۳۔ وارث شاہ، ص ۳۸۴

۲۴۔ ایضاً، ص۴۸۸

۲۵۔ ایضاً، ص۱۹۴

۲۶۔ نجم حسین سید، ''ہیر وارث شاہ، نقل دا روپ''، مطبوعہ پنجابی دنیا، شمارہ ۱۹۶۴،۱۶ء، ص۱۱۴